ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

# اختر الایمان کی نظم: تفہیم و تعبیر کا نو آبادیاتی سیاق

# AKHTAR-UL-EMAN'S POEM: THE COLONIAL CONTEXT OF UNDERSTANDING AND INTERPRETATION

***Muhammad Amir Sohail, **Adnan Khan, ***Ghazala Kishwar**

*Lecturer Department of Urdu Language and Literature University of Sargodha
**Lecturer Urdu Government Akhtar Nawaz Khan (Shaheed) Degree College KTS Haripur
***Lecturer Urdu Thal University Bhakkar

***ABSTRACT:***

*Modern Urdu poetry is divided into two major trends. The first is collectivist and the second is individualism. Akhtar-ul-Eman has adopted a balanced attitude between the two tendencies. Under the colonial situation human pain, anguish, sorrow, boredom and resentment aroused in Akhtar-ul-Eman reflections. He have a crisis of memory and identity vividly. In this statement of the past, the desire for freedom, aspiration and ideal perspective is seen. In the lower level of his poems, there is a statement of the political, social and human moral decay of his era. He is silently protesting against the colonial situation. This is seems an anti-colonial attitude in a broder sense. The internal experience in the system is a reflection of their personality which has grown up with the political, social, economic conditions around them and the forced colonial exploitative system. This article presents a study of Akhtar-ul-Eman's poems published in the colonial era in a colonial context.*

***Keywords:***

*Akhtar-ul- Eman, Modern Urdu Poetry, Political Consciousness, Colonial Situation, Sadness, Internal Experience, Anti-Colonial Emotions*

شعر و ادب کی صنفی، وجودیاتی، علمیاتی اور تخلیقی آئیڈیالوجی ہوتی ہے۔ اس پر اگر نظریے کا جبر غالب ہو جائے تو عین ممکن ہے ادب اپنی ادبیت اور تخلیقیت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ تاہم یہاں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ فکر و فن میں توازن پیدا کر کے اچھی ادبی تخلیق خلق کی جا سکتی ہے۔ فکر، نظریہ، سوچ، خیال، جذبہ اور ان سب کا اظہار بے حد اہم ہے، اور اگر یہ اظہار ادب کی آئیڈیالوجی سے انحراف کیے بغیر انجام کو پہنچے تو یہی تخلیق کار کا فن کہلائے گا۔ لفظ اور معنی، مواد اور ہئیت، موضوع اور اسلوب، فکر اور فن میں سے کسی ایک کا غالب ہونا یا ہو جانا، ادب کو یا تو ادب کی آئیڈیالوجی سے دور کرتا ہے یا پھر ادب کی ادبیت تو برقرار رہتی ہے لیکن وہ فکری حوالے سے انتہائی سطحی، معمولی، عام اور قاری کے لیے بوجھل ثابت ہو سکتا ہے۔ دونوں کی باہم کمال جڑت، وابستگی اور ہم آہنگی سے ادبی تخلیق بامعنی ٹھہرے گی۔ فکر و فن دونوں کی معراج نظم کی کامیابی ہے۔ یاد رہے، عام اور مکرر موضوع کو بھی نظم نگار اسلوب، ہیئت، تکنیک اور فنی پختگی عطا کر کے انوکھا، بامعنی، نیا اور متاثر کن بنا سکتا ہے۔ 'جدید نظم کو سمجھنے کے دو زاویے ہیں۔ تاریخی و شعریاتی۔'(1) تاریخی مطالعہ میں آغاز و ارتقا، ہیئت و تکنیک میں تجربات اور موضوعاتی حوالہ اہم ہوتا ہے جبکہ شعریات میں اس کی فنی و جمالیاتی حیثیت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس مطالعہ میں اختر الایمان کی نظم کو تاریخی تناظر بالخصوص نو آبادیاتی عہد میں اس کی نظم کا نو آبادیاتی صورت حال پر ردعمل اور استعمار مخالف جذبات کو نظمیہ متن کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔

نظمیہ متن میں احتجاجی لہجہ، مزاحمتی رویہ، انقلابی رجحان، نعرہ بازی پر مشتمل اسلوب اور بالکل واضح، عیاں مدعا، خیال، جذبہ اور فکر پیش کرنے والوں نے نظم کی صنفی، علمیاتی، تخلیقی اور وجودیاتی آئیڈیالوجی پر فکری آئیڈیالوجی کو برتری دی ہے۔ اس کے برعکس نظم کو کسی بڑے خیال سے مزین کرنے کے بجائے بے جا فنی حربوں اور ابہام (کسی کے ہاں یہ بے معنی شعریات) میں قید کرنے والوں نے فکری سطحیت اور داخلیت کو پیش کیا ہے۔ تاہم دونوں جانب ایسے نظم گو شعرا موجود ہیں جنھوں نے نظمیہ متن کی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

تخلیق کا متوازن رویہ اختیار کیا ہے۔ متوازن رویہ پر چلنے والوں میں اختر لایمان اہم نظم گو شاعر ہیں۔ فکر و فن کے اعتبار سے وہ ترقی پسندوں کے قریب ہیں نہ جدیدیت پسندوں میں شامل ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جدیدیت پسند انھیں اپنے صف میں دیکھتے ہیں اور ترقی پسند ناقدین انھیں اپنی فکری آئیڈیالوجی کے قریب پاتے ہیں۔ جدید اردو نظم کے دو معروف فکری دھارے ہیں۔ اول خارجی مظاہر دوم داخلی کیفیات کے ذیل میں ہیں۔ خارجی مظاہر میں فطری، سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی، مزاحمتی اور احتجاجی موضوعات شامل ہیں۔ داخلی کیفیات میں یادِ ماضی، یادرفتگاں، شناخت کے بحران کا بیان، خارجی زندگی سے متاثر وجودی اظہار، ذاتی جذبات، مشاہدات اور تجربات شامل ہیں۔ اول الذکر اجتماعی جبکہ موخر الذکر کی نوعیت انفرادی ہے۔ یہ انفرادی معاملات بھی کسی صورت زندگی کے خارجی رخ سے بیگانہ نہیں ہیں۔ اختر الایمان کا خیال ہے کہ:

"ان کی شاعری، بیک وقت داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ ان کی داخلی دنیا میں خارجی دنیا کی نیرنگیوں، تضادوں اور قیامت سامانیوں کا احساس، کرب، شدت کے ساتھ ابھرتا ہے۔"(2)

ان کی نظموں میں داخل اور خارج کی ہم آہنگی ہیئت اور مواد کی یک جائی کو جنم دیتی ہے۔ ان کے تخلیقی تجربے کا اظہار سطحی اور نعرہ بازی پر بنیاد نہیں کرتا بلکہ بھرپور تخلیقی وفور کے تحت ہوتا ہے۔ ان کی بعض نظمیں "میری آواز"، "میرا دوست-ابوالہول"، "اپاہج گاڑی کا آدمی"، "کالے سفید پروں والا پرندہ" اور "میری ایک شام" ہیں، ان نظموں کی قرات سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ کیسے نظمیہ متن نعرہ بازی اور بلند آہنگی سے ماورا ہو کر فکری پرداخت میں احتجاج اور مزاحمت کا استعارہ بن جاتا ہے۔ نظم داخلیت، شخصیت کے والہانہ اظہار اور انفرادی تجربات کا تخلیقی اظہار ہے۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ داخلیت کیفیات، شخصیت اور انفرادی تجربات خارجی زندگی کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ اختر الایمان کے داخلی اور تخلیقی تجربے کا اظہار فنی و جمالیاتی کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ داخلی تجربہ ان کی اُس شخصیت کا غماز ہے جو اپنے اِرد گرد کے سیاسی، سماجی، معاشی حالات اور جبری نو آبادیاتی استحصالی نظام سے پروان چڑھا ہے۔ ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

"اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ ہر زمانے کی بلند پایہ شاعری میں ایک نوع کی اقدار پسندی کی نشان دہی ضرور کی جاسکتی ہے اور یہ اقدار پسندی ظالم کے خلاف مظلوم اور کہنہ روایات کے برخلاف نئے نظام یا شاعر کے خوش آئند خوابوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس بات کو یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ شاعری میں آدرش پسندی کی زیریں لہریں ہی اسے مستقبل کے قاری کے لیے بامعنی بناتی ہیں۔"(3)

اختر الایمان کی شعری جمالیات علامتوں، تمثالوں اور استعاروں سے، زین ہے جس میں ان کی فکریات مضمر ہیں۔ رولاں بارتھ کے الفاظ میں اختر الایمان نے محرر یا منشی کا کردار ادا نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے فکر، جزبہ، خیال اور تجربہ کو اپنی ذات میں جذب کیا، اس کا مادی اظہار نظمیہ متن کی صورت میں ہوا، جس کی نوعیت کہیں احتجاجی، مزاحمتی اور انقلابی ہو کر بھی لہجے، رویے، اسلوب اور ڈکشن میں نعرہ بازی سے کوسوں دور ہے۔ اختر الایمان کے ہاں سیاسی و سماجی شعور، جدید زندگی کے مسائل، جبر، استحصال کے باعث فرد میں پائی جانے والی تشکیک، مذہبی شعار سے لاتعلقی کا نوحہ، ماضی کی زندگی کی رنگینی، انسانی کرب، بے بسی اور لاچارگی لے ساتھ خود غرضی اور انسانی بے رحم دلی کا اظہار روح کی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

آواز بن کر ہوا ہے۔ان کی نظموں کی زیریں سطح میں اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور انسانی اخلاقی انحطاطی کا بیان ہوا ہے۔اس بیان آزادی کی خواہش، آرزو، آدرش اور کوشش شامل ہے۔اس مقالے میں اختر الایمان کی نو آبادیاتی عہد میں شائع ہونے والی نظموں کا نو آبادیاتی تناظر میں مطالعہ پیش کیا جارہا ہے۔

نو آبادیاتی عہد کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی یلغار نے ہندوستانیوں میں کیا اخلاقی کمزوریاں پیدا کیں، کس طرح انھیں اپنی تہذیبی و ثقافتی زندگی، شعار اور اقدار سے دور کر کے دوراستوں میں لا کھڑا کیا۔نو آبادیاتی صورت حال کے پیش نظر اختر الایمان میں انسانی درد، ہم دردی، کرب، دکھ اور رنجیدگی نے جنم لیا۔انھوں نے جب شاعری شروع کی تو اس وقت عالمی سیاسی پس منظر کیا تھا، بقول محمد حسن:

"ان کی شاعری کے تیور بتاتے ہیں کہ ان کی ذہنی پرداخت جنگ عظیم کے زمانے سے کچھ پہلے ہوئی ہوگی۔جنگ عظیم سے کچھ پہلے چین میں جاپانی سامراج کی فتح، ہسپانیہ میں جمہوری طاقتوں کی شکست، ابی سینیا میں مسولینی کے فاشزم کی فتح، اور ہٹلر ناتسیت کے سامنے چمبرلین کی کمزور سیاست اور جانب خود ہندوستان میں برطانوی استبداد کا استحکام اور قومی لیڈر کی بے بسی ایسی باتیں تھی۔"(4)

ہندوستان میں برطانوی استعمار کی تہذیبی یلغار نے مقامی تہذیبی و ثقافتی مظاہر، نقوش اور شعار کو مٹانے، مسخ کرنے اور ختم کرنے کا کام کیا۔مغربی تہذیب چوں کہ مادیت پر قائم تھی اس لیے اس نے انسانوں میں ظاہری شان و شوکت کے حصول کی خاطر حرص، لالچ، خود غرضی اور انسانی بے توقیری و بے وقعتی جنم دیا، رشتوں میں اخلاص ختم ہوتا گیا۔اختر الایمان کی شاعری میں ہمیں ایک ایسے انسان کا پتہ چلتا ہے اس صورت حال کو دیکھ کر گہرے دکھ، ملال، افسوس اور خواہش میں مبتلا ہے کہ انسان میں انسانیت واپس آ جائے اور انسان کی آزادی ممکن ہو۔ہر طرف جبر، ظلم اور پر تشدد حالات ہیں۔خدا صفت انسانوں سے بے زاری اور بے رخی کا اظہار یوں کرتے ہیں:

اب ارادہ ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تا کہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں
ایسے انسانوں سے پتھر کے صنم اچھے ہیں
ان کے قدموں پہ مچلتا ہے دمکتا ہوا خوں
اور وہ میری محبت پہ کبھی ہنس نہ سکیں
میں بھی بے رنگ نگاہوں کی شکایت
یا کہیں گوشہ اہرام کے سناٹے میں

جا کے خوابیدہ فراعین سے اتنا پوچھوں

ہر زمانے میں کئی تھے کہ خدا ایک ہی تھا

اب تو اتنے ہیں کہ حیران ہوں کہ کس کو پوجوں

انسانوں کی پوجا (حاکم، غالب، استعمار، ظالم، نو آبادکار، استحصال کار) سے شاعر بے زار ہو گیا ہے۔ پتھر کے صنم اچھے ہیں جن سے گھبرانے پر ان سے ٹکرایا بھی جا سکتا ہے۔ نظم کی زیریں سطح اس بات کا اعلامیہ ہے کہ وہ معبود (وہ انسانی حاکم ہو یا پتھر کا صنم) سے ٹکرانا، لڑنا، الجھنا، مزاحمت کرنے اور اس کا سامنا کرنے پر آمادہ ہے۔ نظم کے آخر میں استفساریہ لہجہ ہے کہ اس دورِ استحصال و انحطاط میں کس کو خدا سمجھ کر پوجا جائے۔ یہ آدمی کا آدمی پر اجارہ حاصل کرنے کے خلاف گہرا طنز ہے۔ انسان، انسان سے ڈسا جا رہا ہے۔ نظم 'تشخیص' میں انھیں شفاخانے میں لاجاتا ہے جہاں زد گزیدہ لوگوں کا بھیڑ دیکھ کر کہتے ہیں:

بشر گزیدہ ہوں لے چلو یہاں سے مجھے

مرا مرض نہیں پہچانتا یہاں کوئی

بشر گزیدہ کی ترکیب انوکھی اور معنی خیز ہے۔ آدمی آدمی کو فتح کر رہا ہے اور اس کے درپے ہے۔ نظم 'موت' کے آخری بند دیکھیں:

اف یہ مغموم فضاؤں کا المناک سکوت

کون آیا ہے ذرا ایک نظر دیکھ تو لو

توڑ ڈالے گا یہ کم بخت مکاں کی دیوار

اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا

کسی کے آنے سے فضا مغموم اور المناک سکوت میں بدل گئی ہے۔ جو آیا ہے اسے دیکھنے کی طرف شاعر متوجہ کر رہا ہے۔ یہ مغربی استعمار کی طرف اشارہ ہے۔ 'مکاں' مقامی تہذیب ہے جس کی دیواریں مقامی ثقافتی مظاہر ہیں۔ نظم میں محبوب کی جھوٹی تسلیاں بھی ہیں، یہ محبوب 'مقامی استعمار معاونین' ہیں۔ شاعر جانتا ہے کہ آنے والا مقامی تہذیب کو ختم کر ڈالے گا، جس کے باعث ہم دب کر مر جائیں گے۔ مغربی تہذیبی یلغار نے مقامیت کو مسخ کیا، اس سے غم اور رنجیدگی کی کیفیت پیدا ہو گئی، اسی غم اور دکھ کا اظہار ہمیں ان کی نظموں میں ملتا ہے۔ نئی تہذیب اور مقامی تہذیب کے تفاعل / ملاپ سے مخلوط تہذیب نے جنم لیا۔ مقامیوں کا استعماری تہذیب کو اختیار کرنا 'نقل' کے اس تصور کے مطابق ہے جسے فینن اور ہومی کے بھابھا نے پیش کیا ہے۔ مغربی تہذیب کی مضحکہ خیز نقل مقامی کو اپنی تہذیب سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ مقامیت سے دوری اور استعماری تہذیب کی یلغار نے اختر الایمان کے وجود میں اضطراب پیدا کر دیا۔ جس کا اظہار "مسجد"، "تنہائی میں"، "جگولو"، "میں تمھاری ایک تخلیق"، "ایک لڑکا"، "دوسری بات" اور "پرانی فصیل" میں زیریں سطح پر موجود ہے: نظمیہ متن سے حوالے درج کیے جاتے ہیں:

ایک ویران سی مسجد کا شکستہ سا کلس

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

پاس بہتی ہوئی ندی کو تکا کرتا ہے

اور ٹوٹی ہوئی دیوار پہ چنڈول کبھی

گیت پھیکا سا کوئی چھیڑ دیا کرتا ہے

یا ابابیل کوئی آمد سرما کے قریب

اس کو مسکن کے لیے ڈھونڈ لیا کرتی ہے

اور محراب شکستہ میں سمٹ کر پہروں

داستان سرد ممالک کی کیا کرتی ہے

فرش جاروب کشی کیا ہے سمجھتا ہی نہیں

کالعدم ہو گیا تسبیح کے دانوں کا نظام

طاق میں شمع کے آنسو ہیں ابھی تک باقی

سب مصلے ہے نہ منبر، نہ موذن نہ امام

(مسجد)

فرض اک دور آتا ہے، کبھی ایک دور جاتا ہے

مگر میں دو اندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں

مرے تاریک پہلو میں بہت افعی خراماں ہیں

نہ توشہ ہوں، نہ راہی ہوں، نہ منزل ہوں، نہ جادو ہوں

(پرانی فصیل)

زمیں اپنے محور پہ گردش میں ہے حسبِ دستور یونہی

برق کے قمقمے جگمگانے لگے شہر میں، لالٹینوں کے بدلے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

مشرقی پیرہن کہ جگہ کوٹ پتلون اب عام ہے ہر طرف، ہر جگہ

بیٹھنے، اٹھنے، کھانے، پہننے کے دیرینہ آداب واطوار سب اٹھ گئے

(جگولو)

میں تو پروردہ ہوں ایسی تہذیب کا

جس میں کہتے ہیں کچھ اور کرتے ہیں کچھ

شر پسندوں کی آماجگاہ

امن کی قمریاں جن میں کرتب دکھانے میں مصروف ہیں

میں ربڑ کا بنا ایسا بوا ہوں جو

دیکھتا، سنتا، محسوس کرتا ہے سب

پیٹ کے جس کے سب زہر ہی زہر ہے

پیٹ میرا کبھی گر دباؤ گے تم

جس قدر زہر ہے

سب الٹ دوں گا تم سب کے چہروں پہ میں

(میں تمھاری ایک تخلیق)

ناقدین کے نزدیک مسجد کی ویرانی اور تنہائی سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ یہ مسجد انسانی دنیا سے جلاوطن ہو گئی ہے۔(5) نظم میں 'ویران سی مسجد کا شکستہ سا کلس' ایک ایسی تہذیب کا اشارندہ ہے جو زوال پذیری کی آخری نہج تک پہنچنے کے بعد، اپنی عظمت رفتہ کا کھوکھلا اظہاریہ بن گئی ہے۔(6) مزید یہ کہ وقت اس ویران سی مسجد کو بھی ختم کرنے پہ تُلا ہے۔ 'مسجد' مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے۔ مسجد مذہبی اقدار اور شعار کی علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔ اسے وسیع معنوں میں پوری مشرقی تہذیب بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ کم وبیش اردو تنقید کا بیانیہ یہی ہے کہ 'مسجد' گم ہوتی تہذیب اور اخلاقی اقدار کا نوحہ ہے۔ تاہم کچھ سوال باقی رہ جاتے ہیں۔ شاعر نے 'مسجد' کو ہی موضوع کیوں بنایا ہے۔ مسجد مسلم تہذیب کا سب سے بڑا مذہبی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی مرکز / نشان / مظہر ہے۔ اس کا نوحہ مسلمانوں کے لیے زیادہ ہے جو مشرقیت سے دور ہو رہے ہیں۔ مسجد سے بیگانگت دراصل نئی تہذیبی جارحیت کی مرہون منت ہے۔ "1857ء کے بعد نہ صرف نئی نئی معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوئیں بلکہ اس نے اسلامی اقدار کو چیلنج کیا، جس کے نتیجے میں نئی اور پرانی قدریں یا قدامت اور جدیدیت میں ایک کشمکش سی پیدا ہو گئی۔"(7) نظم 'پرانی فصیل' میں "دو اندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں"، یہ دو اندھیرے 'ماضی اور حال'

ہیں۔ماضی وہ جو استعماری بیانیوں نے مسخ کر کے مقامیوں کے لیے ناقابل تقلید قرار دے کر دھندلا کر دیا، جس کے نقوش آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں اور حال نو آبادیاتی نظام کا جبری استحصالی نظام ہے۔ دو اندھیروں کے درمیان ہونا "دوجذبیت" کی صورت ہے۔ دونوں تہذیبیں اپنی طرف مقامی کو بولاتی ہیں۔

نو آبادیاتی جدیدیت نے نئی زندگی مقامیوں پر مسلط کی ہے، جو شہری اور مادیت پر بنیاد کرتی ہے۔ اس سبب دیہات کی زندگی کا وجود خطرے میں پڑ گیا۔ شہری زندگی سرمایہ داری نظام پر مشتمل ہے۔ مقامی تہذیبی اقدار کی حامل زندگی ختم ہوئی۔ نئی زندگی نے شدید کرب، دکھ اور رنجیدگی کی فضا پیدا کی۔ نظم "ایک لڑکا" میں دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلے، آموں کے باغات، کھیتوں کی فضا، جھیلوں کا پانی، بستی کی گلیاں، کم سنی کی نیم عریانی بے خوف زندگی، میلوں، ناٹکوں اور ڈیروں کی رونقیں، ننھے پرندوں کے تعاقب کرنے کی لذت، مدرسوں اور خانقاہوں کا روحانی ماحول، درختوں پر چڑھنا، اور بے خوف بھاگنا دوڑنا سب بچپن اور دیہات کی پر سکون، اطمینان بخش، بے خوف، محبت اور اپنائیت والی زندگی شاعر کو یاد آتی ہے۔ نظم میں ایک فرد ہے جو دو شخصیتوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس کی وہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کے روبرو ہیں اور مکالمہ کرتی ہیں۔ ایک فرد دو تہذیبوں میں کھڑا ہے۔ جس تہذیب میں اس کا بچپن گزرا ہے، وہ اسے پر سکون اور اطمینان بخش نظر آتی ہے اور دوسری نئی تہذیب جس میں وہ پر ملال، مضطرب اور کرب کی زندگی گزار رہا ہے۔ پرانی تہذیب والا اختر الایمان نئی تہذیب والے اختر الایمان سے پوچھتا ہے، "اختر لایمان تم ہی ہو؟"۔ نظم کا آخری بند جس میں لڑکا اور بیان کنندہ موجود ہیں۔ بیان کنندہ لڑکے کو جواب دیتا ہے کہ 'جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم 'مزید' میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے / کبھی چاہا تھا اک خاشاکِ عالم پھونک ڈالے گا'۔ لڑکا مسکرا کر جواب دیتا ہے 'یہ کذب و افترا ہے، جھوٹ ہے، دیکھوں میں زندہ ہوں'۔ لڑکے کا زندہ ہونا مشرقی / مقامی / ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا زندہ ہونا ہے۔ کسی کے مٹانے کلچر مٹ نہیں جاتا، اس کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور وہ باقی رہتا ہے۔ ہر تہذیب اپنی پہچان، شناخت اور بقا کی جدوجہد میں رہتی ہے۔

نظم "جگولو" میں پکی سڑک، بگیوں کی موٹر کار، مشرقی لباس کی جگہ کوٹ پتلون، نیز نشست و برخاست اور طعام و اطوار کے جملہ آداب مشرقی کے بجائے مغربی اپنائے کا ذکر کیا ہے۔ اس نقل نے مقامی اقدار سے بیگانگی پیدا کی ہے۔ جو نئی تہذیبی صورت حال پیدا ہوئی اس نے روحانیت سے دور کر مادیت کے قریب کر دیا۔ نظم "میں رتمھاری ایک تخلیق" میں تہذیبی زوال اور سماجی دوئی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ایسے انسان کا بیان ہے جس کی شخصیت کی تشکیل اس تہذیبی ماحول میں ہوئی ہے 'جس میں کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہیں' اور 'شر پسندوں کی آماجگاہ' ہے۔ انسانوں میں دوسرے انسان کے لیے زہر ہے، یہ زہر بغض، حسد، کینہ، منافقت، لالچ اور انسان کو فتح کرنے استحصال کرنے کا ہے۔ نظم "تصور" کو پڑھ کر منٹو کا افسانہ "نیا قانون" آجاتا ہے۔ منٹو کا تخلیق کردی کردار 1935ء کے انڈیا ایکٹ کے بعد کی اس صورت حال کو دیکھنے کا متمنی ہے جس میں حاکم اور محکوم، نو آبادکار اور مقامی باشندہ، غالب اور مغلوب، انگریز اور ہندوستانی اور ظالم اور مظلوم برابر ہوں۔ کسی کو کسی پر برتری نہ ہو لیکن ایسا نہیں ہو پاتا۔ محسوس ہوات ہے نظم 'منگو' کے جذبات میں بیان کی گئی ہے۔ 'مجھ سے میری آرزوئے دید بھی چھننے لگی / پھر وہی تاریک ماضی، پھر وہی بے کیف حال / پھر وہی بے سوز لمحے، پھر وہی جام شراب / پھر وہی تاریک راتوں میں خیال مہتاب'۔

گرداب کی آخری نظم "پگڈنڈی" کو موضوع بنایا گیا ہے، جس پہ 'آنے والے او عر مسافر پہلے نقش مٹا دیتے ہیں'، کا اشارہ استعمار کی جانب ہے۔ جنھوں نے مقامی تہذیب کو مٹا کر نئی تہذیب کو مسلط کیا۔ تاہم شاعر جانتا ہے 'تاریکی آغازِ سحر ہے، تاریکی انجام نہیں ہے'۔ اس نظم میں امید کی کرن دکھائی دیتی ہے۔

اختر الایمان کی طویل تمثیلی نظم "سب رنگ" 1943ء میں لکھی گئی لیکن اس کی اشاعت 1947ء میں ہوئی ہے۔ یہ ڈرامائی تمثیلی نظم نو آبادیاتی عہد کی سیاست، استعماری نظام اور مقامی سیاسی راہنماؤں کا اصلی چہرہ سامنے لانے کے ساتھ ساتھ مقامیوں کی کمزوریوں کو منکشف کرتی ہے۔ اس نظم میں ہندوستان کا ہمیشہ استحصال زدہ رہنے کی وجہ کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ نظم استعماری مظالم کے اثرات کو سامنے لاتی ہے۔ نظم میں نو آبادیاتی سیاست کے سب رنگ شامل ہیں۔ جو کردار پیش کیے گئے ہیں ان کو ہم نو آبادیاتی عہد کی سیاست میں

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

سے بہ آسانی پہچان سکتے ہیں۔ نظم میں مقامی سیاست دانوں کا انگریزی حمایت کرنا اور انگریزوں کے ہاں ان کی حیثیت اور وقعت کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ استعمار کار کا نفسیاتی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مقام ایک جنگل ہے۔ تماشائی شجر و حجر ہیں۔ وقت اندھیرے اور اجالے کے درمیان ہے۔ زمانہ ہمارا آپ کا ہے۔ "مقام کو برِ اعظم ایشیا سے جوڑنا ایک طرح کی اشاراتی ترکیب ہے کہ ایشیا کے کئی ممالک نظم کی تخلیق کے وقت برطانوی سامراج کے غلام تھے۔ تماشائی شجر و حجر کو قرار دیا ہے یہ اس امر کا علامیہ ہے کہ نو آبادیاتی آقاؤں نے برِ اعظم ایشیا کے عوام کو ایک تماشائی بنا دیا ہے جن کے اندر شجر و حجر کی طرح ہی حرکت و عمل نہیں رہی ہے۔ وقت سے مراد تاریخی وقت ہے۔ اندھیرے اور اجالے کے درمیان سے مراد برزخ کی حالت ہے یعنی غلامی اور آزادی کے درمیان ایک کشمکش کی صورت حال۔"(8) نظم کے کردار جن کی وضاحت خود اختر الایمان نے کر دی ہے۔ نظمیہ کردار آدم (بدیسی / استعمار)، سانپ (سیاسی راہنما)، گدھا (پٹے ہوئے شہزادے)، کتا (خطاب یافتہ)، بندر (ناقص تفکر)، گینڈا (تخریبی کردار)، چڑیا (ابن الوقت)، خچر (والئ ریاست)، بیل (محنت کش)، ہُدہُد (مذہبی رہنما)، اُلو (اہنسا)، پہلا اور دوسرا گدھ (سرمایہ دار) ہیں۔ آخری کردار قوتِ حیات و نمو (نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خدا ہے) ہے۔ نظم افتتاحیہ اور اختتامیہ کے ساتھ چار رنگوں پر مشتمل ہیں۔ "یہ نظم 1940ء کی دہائی کی نو آبادیاتی، سیاسی صورتِ حال پر گہرا طنز کرتی محسوس ہوتی ہے۔ نظم کا بنیادی ارتکاز اس نکتے پر ہے آدم یعنی انگریز نے ہندوستانیوں کو غلام بنانے اور تاریخ و ثقافت سے جلاوطن کرنے کا عمل گدھوں، خچروں اور سانپوں جیسے مقامی عناصر کی مدد سے کیا۔"(9) نظم نگار نے ابتدا میں ہی تعارفیہ حصہ میں چند نکات بتائے ہیں، ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

1۔ جب دنیا بھر میں تاریکی تھی، تب اس جنگل کے جانور روشنی میں تھے۔

2۔ بیرونی سیاح جو اس جنگل کے جانوروں کو جانتے پہچانتے کی کوشش کرنے آئے، ان کے مطابق اس جنگل کے تمام جانور آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔

3۔ باہر سے اگر کوئی لڑنے والا آجائے تو اس جنگل کے طاقت ور جانور اس باہر والے کا ساتھ دے کر اپنے ہی ہم جنسوں کا خاتمہ کروا دیتے ہیں۔ ساتھ دینے والے خود بھی باہر والے حملہ آور کی زد میں آتے ہیں۔

4، اس جنگل کے جانوروں کو ہمیشہ تند خو آدم کی ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے۔

5۔ باہر سے اس جنگل میں آنے والے روشنی کے لیے نہیں، سونا اور اون کے لیے آتے ہیں۔

6۔ موجودہ آدم سے پہلے جو سیاح اور مورخ آئے وہ اس جنگل کو جانوروں سے بھرپور خیال کرتے ہیں، تاہم موجودہ آدم نے یہ دریافت کیا کہ اس جنگل کے کچھ جانوروں کو خوف اور لالچ کے ذریعے اپنا ہم نوا بنایا جا سکتا ہے۔

7۔ آدم کو خچر، کتے اور سانپ زیادہ پسند ہیں کہ وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

مذکورہ نکات وضاحت طلب نہیں ہیں۔ برطانوی امپائر نے یہاں جو نو آبادیاتی استعماری نظام قائم کیا، وہ مقامیوں کی معاونت سے ہوا ہے۔ جس عہد میں یہ نظم لکھی گئی وہ برطانوی استعماریت کا آخری حصہ ہے۔ اس جنگل کے جانور جس مسئلے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ بقول اختر الایمان:

"ایک وسیع میدان میں جنگل کے تمام جانور جمع ہیں۔ مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ اگرچہ آدم کی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

تمام تر قوت کا دارومدار ہم پر ہے، اس کے باوجود بھی وہ اپنے آپ کو ہمارا آقا، اشرف المخلوقات

اور نہ معلوم کن کن ناموں سے یاد کرتا ہے۔ اس کے اس دعویٰ کے خلاف صدائے احتجاج

بلند کرنی طاہیے۔"(10)

اس اقتباس سے چند باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ نو آبادیاتی عہد کے آخری حصے میں مقامیوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ استعمار نے جو خود کو اعلیٰ، برتر اور آقا قرار دیا ہے، یہ ہمارا استحصال ہے۔ مقامیوں میں استعمار مخالف جذبات نے جنم لیا۔ مقامی سمجھ گئے کہ استعماری قوت کا انحصار خود ان پر ہے۔ مقامیوں میں اپنی بے توقیری اور کم وقعتی کا احساس پیدا ہوا۔ استعماری بیانیوں کو رد کرنے کا رجحان پیدا ہوا، گویا ردِ استعماری رویہ ابھر کر سامنے آیا۔ استعماری بیانیوں کے مطابق استعمار کار / یورپی
نسلی، تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی، مذہبی، سماجی، معاشرتی، جغرافیائی اور سیاسی لحاظ سے غیر یورپیوں / مقامیوں سے اعلیٰ، برتر، افضل اور اشرف ہے جبکہ مقامی / غیر یورپی قابل اصلاح، غیر مہذب اور ارزل ہیں۔ غیر یورپیوں اور مقامیوں کی اصلاح یورپ کے سپرد ہے، جو اب انھیں مہذب بنانے آیا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ استعمار روشنی لینے یا دینے نہیں آتا بلکہ وہ لوٹنے، استحصال کرنے، مغلوب کرنے اور انسان پر اجارہ حاصل کرنے آتا ہے۔ اس جانب ناصر عباس نیر نے اشارہ کیا ہے:

"نو آبادیات کا یہ ایک ایسا تضاد تھا جسے بہت کم اہل نظر نے سمجھا۔ یورپی نو آبادیات خود کو جدیدیت

اور صنعتی سرمایہ داریت کی علمبردار بنا کر پیش کرتی تھی، اور اپنے اس امیج کے ذریعے ہندوستان سمیت

دیگر نو آبادیوں کو یقین دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ وہ انھیں غلام بنانے نہیں آئی، انھیں فکری سطح

جدیدیت اور معاشی سطح پر سرمایہ داریت کی برکتوں سے فیض یاب کرنے آئی ہے لیکن اختر الایمان

کے لفظوں میں یورپی نو آبادیات گدھوں، خچروں، کتوں اور سانپوں جیسے قدامت پسند طبقوں کی

حمایت کر کے، بیلوں کے بجائے انھیں بااختیار بنا کر خود اپنے دعوے کی نفی کرتی تھی۔ لہٰذا انگریز

راج کی اگر کوئی برکتیں تھیں تو ان سے قدامت پسند بالائی طبقات مستفید ہوئے۔"(11)

نظمیہ متن کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے، سانپ کی صدارت میں گدھا خوابِ غفلت سے جاگنے اور نو آبادیاتی عہد کی تاریکی سے نکل کر آزادی حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ بندر سانپ کی صدارت پر اعتراض کرتا ہے۔ سانپ نے اپنے جملہ خصائص بیان کرتے ہوئے اپنی صدارت کا جواز پیش کیا۔ بندر پھر کہتا ہے چند دوستوں کی وجہ سے آپ صدر بن بیٹھے، یہ طریقہ جمہوری نہیں ہے۔ سانپ کہتا ہے اگر آپ کو میری صدارت منظور نہیں ہے تو آپ جاسکتے ہیں، بندر کہتا ہے:

کیا یہی جسے جمہور کا راج

کہتے ہیں لوگ مگر

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

جس میں جمہوری آواز نہیں

کیا یہی ہے وہ شجر

جس کے پھل صرف وہی کھائیں جو باثروت ہیں

جن کی بھیڑوں کے گروہ

ہر پناہ گاہ میں ہیں

ہر چراگاہ میں ہیں

یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں "غیر" کے لیے کیا جانے والا احتجاج، دیکھتے ہی دیکھتے اپنوں کے خلاف چل نکلتا ہے۔ اس لیے کہ صرف "غیر" ہی استحصال کار نہیں بلکہ اپنے بھی انصاف پر قائم نہیں ہیں۔ گدھا کہتا ہے، 'کہ آدم، وہ جس کی قوت کا مدار صرف ہماری قویٰ پر ہے، خود کو'، وہ اپنی بات ابھی کر رہا ہوتا ہے کہ محفل میں شور برپا ہو جاتا ہے۔ کوئی کسی کی بات نہیں سنتا، گینڈا اور چڑیا شور مچاتے محفل سے چلے جاتے ہیں۔ گدھا اپنا حسب نسب بتاتے فخر کرتا ہے کہ وہ ماضی میں شہزادہ رہا ہے، اور بچھڑا ہوا ہے کاروانِ ماضی سے، گدھا رونے لگتا ہے۔ سانپ اسے بیٹھنے اور صبر کا حکم دیتا ہے۔ ہدہد عزت و ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے، کا درس دیتا ہے۔ ہدہد مذہبی عنصر ہے جو علت و معمول کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ استبدادی نظام کے استحکام میں مقامیوں کا ہاتھ ہے۔ تاہم وہ ہندوستان میں آنے والے تاریک دور کو اللہ کی مرضی قرار دیتا ہے۔

نظم 'دوسرے رنگ' میں داخل ہوتی ہے۔ گینڈا اور چڑیا دونوں جنگل میں جا رہے ہوتے ہیں دونوں رومانوی ماحول میں ہیں، فکری لحاظ سے نابلد ہیں۔ قومی، عوامی اور سیاسی شعور کے حامل نہیں ہیں۔ چڑیا کو آدم دور سے آتا دکھائی دیتا ہے، جس کے چہرے کی سفیدی میں سرخی ہے۔ ظاہر ہے یہ 'برٹش مین' ہے۔ آدم چڑیا سے پوچھتا ہے، 'کہاں گئے یہ غلامانِ شورہ پشت تمام / ارادہ بد نظر آتا ہے کچھ مجھے ان کا / انھیں خبر نہیں میں بحر و بر کا مالک ہوں / زمین ہی کیا ہے میں شمس و قمر کا مالک ہوں'۔ مغربی استبدادی قوت کا یہ زعم ہے کہ مغرب پوری دنیا کا مالک ہے اور دنیا کی قیادت اسی کے سپرد ہے۔ چڑیا اسے بتا دیتی ہے کہ سب تیرے خلاف جمع ہیں اور ارادہ کیے بیٹھے ہیں، 'آدمی کی ذات سے / واسطہ کوئی نہیں / اب نہیں آئیں گے ہم / اس کی باتوں میں کبھی / جان جائے یا رہے۔' آدم مجلس کی طرف جاتے ہوئے شریک محفل جانوروں کا پوچھتا ہے، کہ آیا کون کون ہیں۔ چڑیا نے بتایا کہ وہاں سانپ اور خچر اور کتا موجود ہے۔ یہ سنتے ہی آدم نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا اگر یہ وہاں موجود ہیں تو پھر خطرہ نہیں ہے۔

نو آبادیاتی نظام کے قیام، استحصال کو پروان چڑھانے اور اس استعماریت کے استحکام میں مقامی (والیان ریاست، سیاسی راہنماؤں اور س، سماجی دانشوروں نے جنھیں برطانوی حکومت کی جانب سے خطاب ملے) باشندوں نے معاونت کی، ورنہ اگر سب استعمار مخالفت پہ اتر آتے تو نو آبادیاتی صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ استعمار معاون مقامیوں نے انفرادی مفاد کو اجتماعی مفاد پر اور ذاتی ترجیحات کو قومی ترجیحات پر فوقیت دی۔ جس سے چند طبقے تو ترقی پا گئے باقی عوام ملکی و غیر ملکی استعمار سے نقصان اٹھاتی رہی۔ برطانوی استعمار کے بعد استعماریت کا دوسرا بڑا فائدہ کالونیل سیاست دانوں، کالونیل جاگیرداروں اور کالونیل سرمایہ داروں نے حاصل کیا ہے۔

نظم کے تیسرے رنگ میں خچر تقریر کر رہا ہے اور مدعا یہ کہ آدم کی کسی معاملے میں مدد نہ کی جائے، جب تک وہ خود یہ نہ کہہ دے، 'کہ ہم غلام نہیں اس کے اور نہ وہ آقا،' اس تجویز کو سانپ نے سخت قرار دیا تو بیل نے اٹھ کر تقریر شروع کر دی۔ بیل کی تقریر محنت کش کسان کی تمثیل ہے۔ وہ کہتا ہے، اس کے دم سے فصلیں ہیں۔ کاشت کاری کی جملہ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

صعوبتیں وہ برداشت کرتا ہے۔ دن رات کی محنت سے زمین کو قابل کاشت بناتا ہے۔ اس کی حالت زبوں حالی کا شکار ہے، جس کا ذمہ دار آدم (ملکی و غیر ملکی استعمار) ہے۔ بیل اپنی تقریر میں کہتا ہے کہ اگر اسے نام نہاد چارہ سازِ زندگی (آدم) مل جائے تو وہ اس سے پوچھا گے گا، ہم زمین کی روح لا کر تجھے دیتے ہیں مگر تو بدلے میں ذلت دیتا ہے اور ہمارے لیے ایک مٹھی بھر گھاس تک میسر نہیں ہے۔ بیل کی تقریر سے محفل میں شور مچ جاتا ہے، سانپ اس صورت حال پہ کہتا ہے:

یہی سبب ہے غلامی کا آپ لوگوں کی

نہ تربیت ہے نہ تنظیم کوئی آپس میں

جھگڑ رہے ہیں مگر مانتا نہیں کوئی

طریقہ کیا ہے کریں کس طرح اسے بس میں

جو اپنا دشمن ماضی و حال و مستقبل

نہ صرف آج ہے پہلے بھی تھا، رہے گا بھی

ذرا سوچیے ہیں آپ کس قدر جاہل

جھگڑ رہے ہیں یہ تدبیر کر نہیں سکتے

بہادروں کی کبھی موت مر نہیں سکتے

نو آبادیاتی صورت حال کا قیام اور استعماری نظام کا استحکام جبر، ظلم اور تشدد کے ساتھ حکمت عملیوں اور تدبیروں سے ہوتا ہے۔ اس استبدادی نظام کا خاتمہ اسی تشدد، حکمت عملیوں اور تدبیروں سے ممکن ہے۔ فرانتز فینن نے 'ردنو آبادیات' کے باب میں دو چیزوں پر زور دیا ہے۔ اول یورپی استعماری بیانات کو سچ نہ مانا جائے دو مغرب کی 'مضحکہ خیز نقل' چھوڑ دی جائے۔ اور اس نئے انسان کی تشکیل کی جائے جو اپنے دوسرے انسانوں کو غلام نہ بنائے، نیز انسانیت کہ فلاح اور انسان کی آزادی کا قائل ہو۔ ردنو آبادیات کے لیے جن تدابیر اور سیاسی شعور کی ضرورت وہ اختر الایمان کے لفظوں میں جنگل کے جانوروں میں مفقود ہے۔ جنگل کے جانور مل کر یک جان ہو کر آدم کے خلاف کوئی واضح مزاحمت کرنی اہلیت رکھتے ہیں نہ وہ استعماریت کو تدابیر اور حکمت عملیوں کے ذریعے ختم کرنے کا سیاسی شعور رکھتے ہیں۔ شاعر ہندوستانیوں کی کمزوریوں کا ذکر کرتا ہے۔ خچر اور کتا (استعمار معاون) اس موقف پر قائم ہیں کہ فی الوقت ہم میں لا ابدی سیاست کا شعور نہیں ہے، جلد ہم آزادی کا شعور حاصل کر لیں گے، کچھ وقت آدم کا ساتھ دینا اور ظلم سہنا ضروری ہے۔ کتا مزید کہتا ہے کہ وہ آدم کی محفل میں جاتا رہتا ہے، بہت رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، آدم کی بقا پر ہماری بقا ہے، اس کا ارادہ نیک ہے، آدم نے اسے (کتے کو) اس جنگل کا راجا بنانے کا کہا مگر اس لیے نہیں بنایا کہ وہ اس سلطنت کو سنبھالنے کے ابھی قابل نہیں ہے۔ خچر اور کتے کی مفاہمتی پالیسی اور ذاتی مفاد کی ترجیح کو سن کر بیل ایک بار پھر کھڑا ہوتا ہے اور تقریر شروع کرتا ہے:

جانتا ہوں اس تمھارے رحم دل آدم کو میں

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

اس کے اخساروں پہ جو

سرخیاں ہیں جلوہ گر

تم سے میں پوچھوں وہ ہے کس کا لہو

اس کی آنکھوں کی چمک

اس کے چہرے کی دمک

اس کی تابانی کا راز

میری بربادی میں

تم سے گر وعدہ حکومت کا ہے، مجھ سے کیوں نہیں

مجھ سے کچھ فہم و فراست میں زیادہ تم نہیں

جانتا ہے وہ کہ تم

بے عمل ہو، جھوٹ سچ

دونوں یکساں ہیں تمھارے واسطے

بیل کی اس تقریر کو آدم خاموشی سے سن رہا ہوتا ہے۔ جب مجمع کو آدم کی آمد اور موجودگی کی خبر ہوئی تو سب کی حالت کیسے ہو گئی، بیل کے زبانی سنیں:

نحیف روحوں، غلام جسموں

زباں پہ کیوں پڑ گئے ہیں تالے

ابھی تو شعلہ بنے ہوئے تھے

ابھی تو سب موت کے حوالے

آدم غصے سے بیل پر اپنے آلہ سے حملہ کرتا ہے، بیل زخمی ہو کر گر جاتا ہے، تمام جانور آدم کے خلاف مزاحمتی اور احتجاجی انداز میں بہ آواز بلند شور مچاتے ہیں۔ اور آدم کے لیے کہتے ہیں، ظلم کا بانی ہے (خرگوش)، ہڈیاں اس کی کچل کر پیس ڈالیں اس کا سر (ہرن)، اس کی بوٹیاں چیلوں اور کوؤں کو کھلا دو (پاڑہ)، خون کا بدلہ خون ہے (چیتل)، انتقام انتقام اب انتقام (خرگوش)۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

چوتھے رنگ میں بیل اور قوت کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے۔ بیل قوت کے روبرو ہے اور اس سے مخاطب ہے، اس کا انداز 'شکوہ' کے رنگ میں ہے۔ بیل کا شکوہ ہے کہ ان پہ ظلم ہوتا رہا ہے۔ قوت بیل کو جواب دیتی ہے۔ 'ہمیں یہ محسوس ہو رہا ہے / کہ تم اشاروں پہ دوسروں کے / ہمیشہ چلتے رہے ہو اگرچہ / تمھیں بھی بخشی تھی عقل ہم نے'۔ قوت نے بتایا کہ تمھاری متانت ہے جس کی وجہ سے آپ ان کے غلام بن کے رہ گئے جو کسی صورت آپ کے ہم درد اور خیر خواہ نہیں ہیں۔ قوت نے بیل سے پوچھا:

ہمارا فرماں ہے یہ زمیں پر

کہ سانپ کتوں کے سامنے تم

جھکاؤ سر اور کچھ نہ بولو؟

کہ خچروں کے جہاں پہ ہوں سُم

وہاں تمھاری جبیں ہو بس

تمھارا آقا ہے ایک آدم

تم آپ آپس میں کچھ نہیں ہو /

---

یہ اور حیرت کی بات ہے تم

نہ جان پائے کہ آستیں کے

جو سانپ ہیں ان سے کیسے بچ کر

تلاش کی جائے رہ خوشی کی

ہمارا فرماں تو یہ نہیں ہے

کہ تم غلامی ہی دوسروں کی

کرو گے اور کچھ نہیں کر سکو گے

قوت کی ان باتوں پر بیل نادم ہو کر رہ جاتا ہے۔ قوت نے بیل کی کمزوریوں بتائیں، جن کی بنیاد پر وہ غلامی کی زندگی گزار رہا ہے۔ بیل کہتا ہے:

میں شرمندہ ہوں اپنی کاہلی پر

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

خدائے مہر و ماہ و آب و ہر رنگ

مجھے خود چاہیے تھا میں جھپٹ کر

اندھیرے سے اجالا چھین لیتا

ہندوستان کی غلامی کا اصل راز قوت نے بیل کو بتایا، اگر اس کا تدارک کر لیا جائے تو استبدادی نظام اور استعماریت سے چھٹکارا حاصل کرنا آسان ہو جائے گا۔ قوت نے بیل سے کہا:

یہ سانپ خچر ہی پاگلو سب

تمھارے امراض کا سبب ہیں

نہیں تو کیا تھی مجال آدم

کہ تم پہ اور حکمران ہوتا

یہ کتے خچر یہ سانپ ہیں سب

تمھارے ناسوران سے بھاگو

یہی تو ہیں جن کے بل پہ آدم

لہو سے تم سب کے کھیلتا ہے

اس مکالمے کے دوران آدم آپہنچتا ہے، جسے قوت غلام کہہ کر پکارتی ہے مگر وہ قوت کے سامنے اکڑ کر کہتا ہے کہ اسے آقا کہیے۔ وہ زمین و آسماں کی تمام وسعتوں کا آقا ہے۔ قوت سن کر مسکرا دیتی ہے۔ قوت کے مطابق مقامیوں کی زبوں حالی، پستی، بے بسی، لاچارگی اور غلامی کی دو وجوہات اہم ہیں؛ اول ان کی ذاتی سستی، کاہلی، مزاحمت نہ کرنے کی جرات، کم عقلی اور قناعت پسندی دوم مقامی راہنما، والیانِ ریاست اور خطاب یافتہ مقامی دانشور کا ذاتی مفاد کی خاطر استعمار کی حمایت اور معاونت کرنا ہے۔ قوت نے بیل کو مشورہ دیا کہ غیر ملکی استحصال کنندہ سے قبل مقامی استعمار معاونین کا قلع قمع کرو۔ معروضی حقائق دیکھیں تو یہ بالکل واضح ہے برصغیر میں نو آبادیاتی عہد میں جو کالونیل جاگیر دار اور کالونیل سرمایہ دار تھے، وہ زیادہ ظلم کر رہے تھے، مقامی سیاست دان ذاتی مفادات کے لیے استعمار کے خلاف احتجاج، مزاحمت اور انقلاب کا نعرہ لگا رہے تھے کہ غیر ملکی آقاؤں سے آزادی حاصل کر کے خود حکمران بنا جائے۔ اس طویل نظم میں اختر لایمان نے محنت کش طبقوں کو بیدادی کا خواب دلایا اور مقامی و غیر ملکی دونوں آقاؤں سے آزادی حاصل کرنی کی طرف متوجہ کیا ہے۔ وقت آیا برطانوی استبدادی نظام سے آزادی مل گئی جو اپنی اصل میں سیاسی و انتظامی آزادی تھی نہ کہ ذہنی و نفسیاتی اور تہذیبی و ثقافتی۔ باقیات نو آبادیات (کالونیل جاگیر دار، کالونیل سرمایہ دار، اسٹیبلشمنٹ، مقامی سیاست دان، نو آبادیاتی تعلیمی نظام) سے ابھی تک مابعد نو آبادیاتی عہد میں بھی آزادی نہیں مل سکی اور نہ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

ہی اس کا خاتمہ مستقبل قریب میں نظر آرہا ہے۔ اختر الایمان نے مقامی و غیر ملکی دونوں استحصالی نظام سے آزادی حاصل کرنے کا ہے۔ ناصر عباس نیر اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

"نو آبادیات اور نئی نو آبادیات کے سلسلے میں یہ کہنا نصف صداقت ہے کہ انھیں غیر ملکی طاقتیں، مقامی قدامت پسندوں اور کچھ لبرل قوتوں کی حمایت سے قائم کرتی ہیں۔ پوری صداقت یہ ہے کہ نو آبادیاتی طاقت صرف بیرونی نہیں ہوتی، وہ مقامی بھی ہوتی ہے؛ بعض اوقات ایک مقامی حکومت خود اپنے عوام کے لیے استعمار کار ثابت ہوتی ہے۔ مقامی استعماریت کو ایک بڑی سہولت یہ حاصل ہوتی ہے کہ وہ غیر ملکی طاقت کے مقابلے میں خود کو زیادہ آسانی سے کیمو فلاج کر سکتی ہے؛ نیز اسے معاون کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ تاہم کوئی نو آبادیاتی صورت حال ایسی نہیں ہے، جس کے خلاف مزاحمت موجود نہ ہو۔"(12)

'گرداب' اختر الایمان کا پہلا شعری مجموعہ ہے، جو 1943ء میں شائع ہوا ہے۔ سہ ماہی 'اردو ادب' کے اختر الایمان نمبر میں محمد فیروز دہلوی کا مضمون "اختر الایمان کی متروکہ نظمیں" شامل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ذکر کیا ہے کہ 'گرداب' کے انتخابی عمل میں ن م راشد اور میراجی شامل تھے جنھوں نے ڈیڑھ سو نظموں میں سے چوبیس نظمیں 'گرداب' کے لیے منتخب کیں۔ جو نظمیں گرداب میں شامل نہ ہو سکیں وہ متروکہ کہلائیں، ان متروکہ نظموں میں سے چند نظمیں فیروز دیلوی نے اپنے مضمون میں شامل کیں۔ نظم "بھکارن" میں شاعر کو سڑک کنارے ایک بے کس، مجبور، بے سہارا، نادار اور بے بس عورت نظر آتی ہے تو اس کا دل غم زدہ، رنجیدہ اور پُر ملال ہو جاتا ہے۔ نظم میں وہ دو دنیاؤں کا تقابل پیش کرتا ہے۔ ایک دنیا سرمایہ دار، جاگیر دار، استحصال کار، استعمار کار، حاکم، ظالم اور جابر کی ہے۔ دوسری دنیا مزدور، کسان، استحصال زدہ، مقامی، مغلوب، مظلوم اور بے کس و مجبور کی ہے۔ شاعر کا لہجہ اور اسلوب شکایت آمیز ہو جاتا ہے اور وہ خدا سے کہتا ہے:

کوئی عیش و طرب میں دن گزارے کوئی مجبور سڑکوں کے کنارے
کوئی دولت سے کھیلے شاد ہو کر کوئی تڑپا کرے ناشاد ہو کر
کوئی دنیا کی کل دولت سمیٹے پھٹے کمبل میں کوئی منہ لپیٹے
اِدھر اک موتیوں سے کھیلتا ہے اُدھر مزور پاپر بیلتا ہے
اِدھر اک زینت آغوش ناگن اُدھر مجبور بیٹھی ہے بھکارن
سنبھال اس اپنی دنیا کو خدارا مجھے یہ بدعتیں کب ہیں گوارا

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

( کالج میگزین،مارچ 1939ء)(13)

استعماری حکمت عملیوں میں 'تعلیمی پالیسی' ہے، جس نے سب سے زیادہ استعماریت کو مستحکم کیا ہے۔ نو آبادکاروں کے لیے یہ چیلنج تھا کہ مقامیوں کو کیسے اور کونسی تعلیم دی جائے، جو نو آبادیاتی صورت حال کو تادیر قائم رکھ سکے۔ لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی کو ہم سب جانتے ہیں جس نے مقامیوں کو مقامیت سے بیگانہ کو کے انگزیزیت لے قریب کیا۔ نو آبادیاتی تعلیم نے مقامیوں میں سے انگریز معاون طبقہ پیدا کیا۔ برطانوی تعلیمی پالیسی کے خلاف اختر الایمان نے "میکالے کی تقریر فرنگی افسران کے روبرو" لکھی۔ جو 'کالج میگزین، مارچ 1940' میں شائع ہوئی۔ نظم میں اختر الایمان نے برطانوی حکمرانوں سے مخاطب ہو کر، شدید طنزیہ لہجے میں نو آبادیاتی تعلیم کے مضمرات کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے:

تدبیر سے لو کام انھیں خوب لبھاؤ رنگین چمکتی ہوئی تصویر دکھاؤ

جو حب وطن ان کے دلوں سے ہی اڑادے تعلیم وہ دو ان کے جوانوں کو مٹادے

کچھ پھانس لے اس طرح انھیں جانہ سکیں پھر بھول کے منزل کی طرف آنہ سکیں وہ

احساس کو، جذبات کو، اجسام کو ان کے رفتار کو، گفتار کو ہر کام کو ان کے

کچھ گھیرے اس طرح نکل ہی نہ سکیں پھر وہ ضرب لگاؤ کہ سنبھل ہی نہ سکیں پھر

جس طرح بنے ان کے تمدن کو مٹادو جس طرح بنے ان کی روایات بھلادو

اس ہند کی تہذیب کا معیار بدل دو ایسا نہ کبھی ہو کہ انھیں درسِ عمل دو

اس طرح انھیں صفحہ ہستی سے مٹادو تخریب کو تعلیم کے پردوں میں چھپادو

نو آبادیاتی تعلیم ہنوز جاری ہے۔ اسی وجہ سے ابھی تک برٹش ایمپائر سے آزاد ہو کر بھی ملک ترقی اور خوشحالی کی راہ پر نہیں آسکا۔ جن مضمرات کا اظہار نظم میں ہم دیکھتے ہیں، وہ بالکل سچ ہیں۔ اختر الایمان نے نو آبادیاتی عہد میں جو شعری فکریات پیش کی، ان سے نو آبادیاتی نظام کے چھپے عناصر، اس کا استحصالی رویہ، مقامی سیاست دانوں اور دانشوروں کے چہرے، مغربی تہذیب کی عطا کردہ مادیت پسندی، مقامیت سے دوسری اور بیگانگی کے نتیجے میں فرد میں پیدا ہونے والی بے مروتی، خود غرضی اور مغربی تعلیمی و ثقافتی یلغار کا بھیانک چہرہ سامنے آتا ہے۔ ان کی شاعری ایک احساس منی، درد دل اور کرب رکھنے والے انسان کا اظہاریہ ہے۔ وہ اپنے عصری سیاسی و سماجی مسائل سے بیگانہ رومانوی فضاؤں میں زیادہ دیر نہیں رہ سکے۔ وہ اس انسان کی تلاش میں ہیں، جس میں انسانیت کا درد ہو۔ جو مغربی فرد سے الگ پہچان رکھتا ہو۔ اختر الایمان مادی تہذیب کے پروردہ انسان سے خوف کھاتے ہیں۔ یہ خوف ان کے اندر وجودی کرب پیدا کرتا ہے۔ وجودی کرب جب نظمیہ متن میں ڈھل کر مادی شکل اختیار کرتا ہے تو ان کی روح کی آواز بن جاتا ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں اختر الایمان نے مزاحمتی، احتجاجی اور آزادی کا شعور پیدا کیا، ان کا یہ رویہ رد استعماری ہے۔ وہ نو آبادیاتی نظام کے جملہ مضمرات سے واقف ہیں اور اس کے خاتمے کے لیے حل بتاتے نظر آتے ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ مغربی مادی تہذیب، تعلیم، نظام اور یلغار نے فائدہ نہیں نقصان پہنچایا ہے۔ اب اس استبدادی نظام سے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

آزادی حاصل نہیں بلکہ چھیننے کا وقت آپہنچا ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں اختر الایمان کی شاعری ہمیں ایک سیاسی شعور، حب الوطنی، انسانی ہم دردی اور قومی غیرت و حمیت رکھنے والے انسان کی دلی آواز محسوس ہوتی ہے۔

## حوالہ جات

1۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر، نظم کیسے پڑھیں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2018ء) ص7

2۔حامدی کشمیری، متن اور تجربہ، مرتبہ: مُصرہ مریم (سری نگر: کمپیوٹر سٹی، راج باغ، 2011ء) ص66

3۔ابوالکلام قاسمی، دیباچہ: اردو نظموں کا احتجاجی آہنگ، مرتبہ: شہزاد انجم برہانی (نئی دہلی: براؤن بک پبلی کیشنز، 2017ء) ص19، 20

4۔محمد حسن، "اختر الایمان" مشمولہ: اختر الایمان عکس و جہتیں، مرتبہ: شاہد ماہلی (دہلی: معیار پبلی کیشنز، 2000ء) ص129

5۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر، نظم کیسے پڑھیں، ص190

6۔ڈاکٹر احتشام علی، جدید اردو نظم کی شعریات (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، 2019ء) ص141

7۔ڈاکٹر محمد آصف، شعر و ادب: نئی تفہیم (ملتان: کتاب نگر، 2020ء) ص24

8۔مولا بخش، "سب رنگ کی قرات کے چند زاویے"، مشمولہ سہ ماہی اردو ادب اختر الایمان نمبر، شمارہ 7-236، جلد 60-59 (اکتوبر 2015 تا مارچ 2016) ص265

9۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر، نظم کیسے پڑھیں، ص182

10۔کلیات اختر الایمان، ص107

11۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر، نظم کیسے پڑھیں، ص182

12۔ایضا، ص240

13۔محمد فیروز دہلوی، "اختر الایمان کی متروکہ نظمیں" مشمولہ سہ ماہی اردو ادب اختر الایمان نمبر، شمارہ 7-236، جلد 60-59 (اکتوبر 2015 تا مارچ 2016) ص64-65

(نوٹ: اس مضمون میں اختر الایمان کی نو آبادیاتی عہد میں شائع ہونے والی نظموں کو شامل کیا گیا ہے۔ مابعد نو آبادیاتی عہد میں ان کی نظموں کا پس نو آبادیاتی مطالعہ الگ مقالے کا متقاضی ہے)